ماهنامہ

ادبِ لطیف

ماھنامہ

ادبِ لطیف

چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 03008479444

ایڈیٹر: شاہد بخاری 03004855148

پبلشر: آفتاب احمد چوہدری 03214048179

پرنٹر: مکتبہ جدید پریس لاہور قیمت: 250روپے

پاکستان میں زرِ سالانہ: 900 روپے (عام ڈاک سے)

: 1000روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے)

بیرونِ ملک زرِ سالانہ: 60 ڈالر / 40 پاؤنڈ

جلد نمبر:78 شمارہ نمبر : 9 ستمبر : 2013ء

39۔گرین ایکرز، رائے ونڈ، لاہور۔53700، پاکستان

Website : www.adab-e-latif.com

Email : adabelatif@hotmail.com

info@adab-e-latif.com

Mobile : 03458479444

فہرست

نعتیں

کلام

مضامین

ترجمہ مضمون

تراجم نظمیں

ترجمہ افسانہ

افسانے

تاریخ

دوہے اور فردیات

دیگر فنونِ لطیفہ

نظمیں

غزلیں

اسد محمد خان

اعجاز ملک

انشائیہ

بیادِ رفتگاں

اسد محمّد خاں-تعارف

حسنین جمال

" کوئی شخص کسی زبان کا کامل ادیب نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ اس نے صرف و نحو، معنی، بیان، بدیع، عروض، لغت، لسانیات، صوتیات، تنقید کے اصول، ادب کی تاریخ اور ادیبوں و شاعروں کے حالات کا علم باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، اور اس زبان کے ادب و شعر کا مدت تک گہرا اور وسیع مطالعہ نہ کیا ہو، یہ سچ ہے کہ بعض لوگ ان علوم سے واقف ہوئے بغیر اچھے اچھے مضامین لکھ لیتے ہیں مگر ایسے لوگوں کو خوش تحریر یا زیادہ سے زیادہ انشا پرداز کہہ سکتے ہیں، ادیب نہیں کہہ سکتے"۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی "اردو زبان اور اس کا رسم خط" میں بیان کردہ اس کسوٹی کے مطابق ہمارے ہاں انشا پرداز بکثرت اور صحیح معنوں میں ادیب بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان معدودے چند ادیبوں میں سے ایک ہمارے اسد محمد خاں ہیں۔

اسد محمد خاں ایک ہمہ جہت ادیب، 1932 میں بھوپال میں پیدا ہوئے، تقسیم کے بعد پاکستان تشریف لے آئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام رہا پھر کراچی میں مستقل قیام پذیر ہوئے۔ اوائل عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے بھی تعلق رہا۔ پہلی کتاب کھڑکی بھر آسمان 1982 میں شائع ہوئی، جس میں کہانیاں اور نظمیں شامل تھیں۔ تا حال سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ "کھڑکی بھر آسمان" (کہانیاں اور نظمیں 1982ء)، "برج خموشاں" (کہانیاں۔ 1990ء)، "رکے ہوئے ساون" (گیت۔ 1997ء) "غصے کی نئی فصل" (کہانیاں۔ 1997ء) "نربدا اور دوسری کہانیاں" (کہانیاں۔ 2003ء) "تیسرے پہر کی کہانیاں" (کہانیاں۔ 2006ء)۔ کتاب "جو کہانیاں لکھیں" میں اسد محمد خاں کی 2005ء تک لکھی

کا سب کہانیاں سچا ہیں۔ "ایک ٹکڑا دھوپ کا" (کہانیاں۔ 2010ء)۔

راقم حروف کی رائے میں اسد محمد خاں کے افسانے میں وہ تمام لوازم بخوبی موجود ہیں جن کی ضرورت ایک اچھے افسانے کی دیوار اسارنے میں ہوتی ہے، کہانی، پلاٹ، کردار، اساطیر، تیکنیک، منظر نگاری، مقام، ماحول، تہذیبی پس منظر، موزونیت، لب و لہجہ، اسلوب، طنز، ظرافت، سماجی و اخلاقی جہات، الغرض کوئی گوشہ کوئی جہت ایسی نہیں کہ جن سے محرومی ہمیں ان کے افسانوں میں دکھائی دے۔ ان کے افسانوں کا ایک اہم پہلوان میں موجود ہفت زبانی بلکہ ہشت زبانی ہے۔ اس مضمون میں ہم نے یہ کوشش بھی کی کہ ان زبانوں سے ان کی اس درجہ واقفیت کا سبب جان سکیں، آیئے کچھ جانتے ہیں۔

بندیل کھنڈی اور مالوی زبان میں مہارت تامہ کے متعلق ایک مختصر غیر رسمی انٹرویو میں بتایا، "بزرگوں اور عزیز رشتہ داروں میں بہت سے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بچپن میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ گاؤں میں ان کے پاس زمینوں پر جایا کرتے تھے، اب وہاں رابطے کی زبانیں یہی تھیں، تو چوں کہ ہمیں نہ صرف وہاں رہنا ہوتا تھا بلکہ دوستیاں بھی بنی ہوتی تھیں اور اپنے عزیزوں سے بھی انہی زبانوں میں بات چیت کرنی ہوتی تھی، تو اس طرح زبان سے واقف ہوتے گئے"۔

پنجابی زبان سیکھنے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب ہندوستان چھوڑا تو کھوکھراپار کے راستے سے آئے مگر کراچی کے بجائے پہلے لاہور گئے کیوں کہ سگے بھائی سیالکوٹ میں پہلے ہی زیرِ تعلیم تھے اور کرشن نگر میں ماموں رہتے تھے۔ اس وقت 17 سال کی عمر تھی، اس عمر میں ویسے ہی سمجھنے سیکھنے کی صلاحیت عروج پہ ہوتی ہے، لہذا پنجابی اسی عرصے میں لاہور میں رہ کر سیکھی۔

کراچی آنے کے بعد ایک سال والٹن ٹریننگ سکول میں رہے، وہاں پاکپتن کے ایک صاحب (اختر بھائی) ان کے ہم جماعت تھے، پڑھنے کے بعد ان کے ساتھ چہل قدمی کو نکل جاتے، اگرچہ وہ اچھی اردو بولتے تھے لیکن اسد محمد خاں ان سے پنجابی سیکھنے کی کوشش کرتے۔ اس وجہ سے پاکپتن کے اطراف کی سرائیکی نما پنجابی میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔

افسانوں میں سکھوں کی پنجابی بھی لکھی ہے جو کہ ایک بالکل مختلف لہجہ ہے، اس کے بارے میں بتایا کہ کچھ دوست سکھ بھی تھے جن کا لہجہ اور زبان ان کے ساتھ گفتگو کی وجہ سے سیکھ گئے ۔

بلوچی اور پشتو زبانیں نہ سیکھ پائے جس کا بہت قلق ہے۔ پاکستان کی سبھی زبانوں سے بہت محبت کا گاہے بہ گاہے اظہار ان کی تحریر اور گفتگو میں عیاں رہتا ہے۔ کراچی میں بسلسلہ روزگار پورٹ ٹرسٹ پر ملازمت کی، مکرانی لہجے پر عبور انہی دنوں کی یادگار ہے۔ بقول خود، "ان دنوں وہاں جو قلی ہوتے تھے وہ سب ہمارے مکرانی، شیدی یا بلوچی بھائی ہوتے تھے، ان سے گفتگو روزمرہ کے معمولات میں شامل تھی، ان کے لہجے کو میں غور سے سنتا، بعد میں تو ان سے بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے، بچوں کی شادیوں میں بھی بلایا، گھنٹہ دو گھنٹے کی شرکت میں ضرور کرتا تھا۔

ادب کی تمام قابل ذکر اصناف میں ان کے فن پارے موجود ہیں جن میں افسانے، شاعری، ریڈیائی خاکے، ٹی وی سیریل، طویل دورانیے کے کھیل، گیت اور ملی نغمے شامل ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی اور مختلف رسالوں میں ان کے کئی شاہکار سامنے آئے جن میں سے پارٹیشن ایک سفر، منڈی، دل دریا، الزام اور زبیدہ یادگار ٹی وی ڈرامے تھے۔ شیر شاہ سوری، ایک طویل دورانیے کا ڈرامہ بھی بہت پسند کیا گیا۔ ڈیڑھ سو سے زائد گیت ٹی وی کے لیے لکھے جن میں 'انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند'، 'تم سنگ نیناں لاگے' اور 'زمیں کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے' جیسے یادگار گیت شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں تمغہ امتیاز اور مجلس فروغ اردو ادب نے کمال فن ایوارڈ سے نوازا ۔

سب رنگ کے قارئین کو ایک یادگار سلسلہ، 'محمود حسن خاں عرف مموں میاں' ضرور یاد ہو گا جو اردو کے جمیز بانڈ تھے۔ وہ یادگار کردار بھی آپ نے اپنی کمرشل رائٹنگ کے دور میں اوج کمال تک پہنچایا۔ ساقی فاروقی نے اپنی سوانح "پاپ بیتی" میں ان کا بہت شگفتہ پیرائے میں تذکرہ کیا ہے، چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے :

"اسد مجھ سے عمر میں چار سال بڑا ہے مگر لکھنے لکھانے میں نو دس سال چھوٹا۔ یعنی جو کام میں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں شروع کیا تھا اس نے اٹھائیس انتیس سال کی عمر میں شروع کیا۔ برنارڈ شا کی طرح"۔

"دو چار نظموں کے بعد ہی اس نے ایک کمال کی نظم "نو منزلہ بلڈنگ" لکھی۔ میں اس نظم اور اس نظم کے خالق کو سارے شہر میں لیے لیے پھرا۔ یہ جتانے کے لیے کہ دیکھو نئی نظم ایسے لکھی جاتی ہے۔ میں نے فرمائش کی کہ فوراً سوغات بنگلور کو بھیج دو۔ اسد اڑ گیا، میں نہیں بھیجوں گا تمہیں بھیجنا ہے تو بھیج دو"۔ چنانچہ میں نے بھیج دی اور محمود ایاز نے نہایت سلیقے سے چھاپی۔ یہ اسد کی پہلی تحریر تھی جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی"۔

"اسد کے تین افسانے ایک ساتھ سننے کا موقع ملا۔ زبان کی ہنرمندی، بیان کی تازگی، کہانی کی بنت اور کردار نگاری کی بالیدگی ایسی تھی کہ میرے تنقیدی اور تردیدی ذہن کی سختی موم کی طرح پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی"۔

ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں: "بلاشبہ افسانے کی سب سے بڑی طاقت اس کی فضا ہے، مگر اس فضا کو بنانے میں اسد محمد خان کرداروں پر بڑی توجہ دیتا ہے، یہ کردار پر چھائیاں نہیں ہیں، معاشرے کے زندہ لوگ ہیں مگر انہیں خود کو پورا دیکھنے کا ہوش یا توفیق نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ہاں سنائی پہلے دیتے ہیں اور دکھائی بعد میں، یہی وجہ ہے کہ چاروں طرف میں گونجنے اور چھا جانے والا اس کا تخلیقی فقرہ اس کے افسانے کی مطلوبہ فضا بناتا ہے، جس سے اندر نا انصافی اور ریاکاری پر افسانہ نگار اپنے مشتعل نتیجے پھیلائے رکھتا ہے"

اسد محمد خان کا نمونہ تحریر ملاحظہ فرمائیے:

"لڑکے کی کمر سے کھانڈا بندھا تھا۔ کھانڈا بوڑھے کی سر بہی سے کوئی سوا ڈیوڑھ لمبائی کا تھا۔ ایسے ہتھیار بلخ اور بخارا سے منگائے جاتے تھے اور صرف نو جوان تلواریوں میں مقبول تھے۔ پرانے اسکول کے ساونت انھیں دیکھ دیکھ کے ہنستے تھے اور طنز کرتے تھے کہ گنوار کھامڑے یا نئے لڑکے... کہتے تھے،

"ای کھانڈا چھوڑو، کلھاڑا کا ہے نئیں باندھ لیہو کمر سے، ہاں بھیا؟"

(نربدا)

شکری بولا، "ٹھاکر! بھئی یار مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ نعمت اللہ خاں صاحب شکری کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ نے بڑی نعمتیں اُتاری ہیں۔ آہاہاہا! ہم تو ٹھاکر بیٹے، شکری ہیں ہی اس لیے کہ نعمتوں کا شکر کرتے ہیں۔" اسے ہچکی آئی تو لمحے بھر کو رکا، پھر کہنے لگا، "بات اپنی کہہ دینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔۔ ویسے یہ باک کیا ہوتا ہے؟۔۔ یاک تو ایک چوپایہ ہے اپنے برفانی علاقوں کا، جس کے سارے بدن پر موئے زیرِ شکم جیسے یہ بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔۔ تو خیر۔۔ مختصر یہ کہ رشوت وغیرہ میاں وکیل، ہم نہیں لیتے۔ ایسے گدھے پن کی آفر وکیل، تم پھر کبھی مت کرنا، ورنہ ہم ٹنڈی کسوا دیں گے قسم ایمان کی!۔۔ آپ نے دیکھا ہوگا، وہ جو ہمارا ڈھیں ڈس حوالدار ہے وہ سالا ٹنڈی کسنے میں ماہر ہے۔ ایک دم حرام الدہر ایکسپرٹ ہے۔ اب آپ جاؤ، بچّے! شاباش، ٹھکرائن کے پاس جاؤ، لیٹو، بیٹھو، ہم بستری کرو، گپ مارو۔۔ چڑھ جاؤ سالو سولی پر، رام بھلی کرے گا"۔

(موتبر کی باڑی)

"مولا اب تو کچھ ایسا ہو کہ ایک فزی سسٹ ہماری ہی صفوں سے اُٹھے جو کھڑے ہو کر سلام پڑھتا ہو، کہ جیبوں میں ڈھیلے لے کر چلتا ہو، جو اشاک ہوم کے چورستوں میں قینچیاں مارے، کہ مشرکین بیرونی اور کفارِ مقامی کا پتا پانی ہووے ___ ہم آرام سے تیرے نام کا بھنگڑا ڈال سکیں، اور ملحدوں کافروں مشرکوں کی بستیوں کی جانب مُنہ پر کلائیاں رکھ کر آرام سے بکرا بُلا سکیں ___ اے صاحب الکلام! ہمارے قوالوں کے حلق کشادہ کر، ہمارے ڈوم ڈھاڑیوں کو زمین پر پھیل جانے کا اذن دے ___ ہمارے کھلاڑیوں ہی کو ہر نوع کی سربلندی عطا کر، کہ اب تو وہی ہمارا اثاث البیت ہیں ___ ہمارے دشمنوں کو اب اندر سے سنگسار فرما، ان کی میانیوں میں برف باری کر، دھماکے فرما۔"

(مناجات، برجِ خموشاں)

"ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیئے جس نے کوفے سے امام کو خط لکھا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ دارالحکومت میں تشریف لایئے حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو، لیکن خط لکھنے کے بعد وہ گھر جا کر سو گیا۔ جب دس ہزار دنیا زادوں نے امام کے مقابل صف بندی شروع کی تو یہ آدمی زیتون کے روغن میں روٹی چور چور کر کے کھا رہا تھا۔ پاس ہی دودھ بھرے پیالے میں حلب کے خرمے بھیگے پڑے تھے۔ شیشے کے ایک ظرف میں کوئی مشروب تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ اشرار آمادہ فساد ہیں تو اس آدمی نے روغن سے سنے ہوئے دونوں ہاتھ طمانیت کے ساتھ چہرے پر ملے اور بولا امام حق پر ہیں اور حق غالب آنے والا ہے۔ اس نے پھر ڈکار لی اور امام کو یاد کیا۔ ان کی حمایت کے لئے اللہ سے نصرت طلب کی۔ اور دستر خوان کے برابر پڑے ہوئے تکیئے پر ٹیک لگا سو گیا۔ جب خبر آئی کہ بچوں پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو روتے روتے اس نے ہاتھ کی ضرب سے عرق کا ظروف الٹا دیا اور کہنے لگا ''وائے افسوس! سگِ دنیا ابنِ زیاد نے، اس کے کتوں نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے''۔ اس بار وہ بہت دیر تک رویا اور کرب و انتشار میں جاگتا رہا۔ پو پھٹنے کے قریب اسے نیند آئی"۔

(شہر کوفے کا ایک آدمی)

ان کے چند مشہور افسانوں جیسے رگھوبا اور تاریخ فرشتہ، باسودے کی مریم، نربدا اور مائی دادا کی ادبی حلقوں میں توصیف کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ لیکن اسد محمد خاں کے اور بھی بہتیرے نشتر ہیں جو شاید تحقیق کے منتظر ہیں۔ ان میں سے چند افسانوں کے متعلق کی گئی گفتگو ملاحظہ کیجیے:

افسانہ۔ کوکون

س: اس افسانے میں ایک محدود زمانی کیفیت کا احساس ہوتا ہے، کہیں کہیں ایسا تاثر ملتا ہے جیسا تیر

مسعود کے افسانوں میں پایا جاتا ہے، آپ اس کیفیت بلکہ مکمل افسانے کے بارے کیا فرمایئے گا؟

ج: اس افسانے کا مرکزی خیال مجھے آج سے دس گیارہ سال پیشتر ایک اسکینڈے نیوین ملک کی خبر پڑھ کر آیا۔ وہاں ایک شخص نے اپنی اولاد کو پیدا ہوتے ہی تہہ خانے میں رکھا تھا۔ وہیں اس کی پرورش کی، اسے گیارہ بارہ برس کھانا وہیں پر پہنچاتا رہا، بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ صرف ریکارڈ شدہ آوازوں اور ریڈیو کا تھا، بلکہ بعد میں اس سے جنسی فعل کیا اور اولاد بھی پیدا کی۔ تو اس مرکزی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوے یہ افسانہ تخلیق ہوا، اب ایک ایسا بچہ جو صرف ریڈیو اور ریکارڈ شدہ آوازیں سنتا ہے اس کی لفظیات بہت محدود ہوں گی، تو مذکورہ افسانے میں محدود لفظیات سے کام لے کر میں نے یہ تاثر دیا ہے، نیّر صاحب کے ہاں بھی جب خواب کا بیان ہوتا ہے تو ان کی لفظیات بہت محدود ہو جاتی ہیں شاید اسی وجہ سے آپ کو یہ مماثلت نظر آتی ہے۔"

افسانہ۔ مدھوری بی کی ادھوری کہانی:

س: سب رنگ میں آپ کا شائع ہونے والا ممن میاں کا سلسلہ بہت مشہور ہوا، 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' میں آپ نے اس کی دو کہانیاں شائع کی ہیں۔ کیا اس کی باقی کہانیاں بھی موجود ہیں؟

ج: دیکھیے بچوں کی تربیت اور گھر چلانے کے لیے میں نے کچھ کمرشل کام بھی کیا، یہ ان میں سے ایک تھا، بلکہ سب سے پہلے شکیل (عادِل زادہ) بھائی کے کہنے پر انھی کے رسالے سے میں نے یہ کام شروع کیا۔ بعد میں اپنے انھی افسانوں میں سے بعض اوقات کسی ایک پیراگراف کو چُن کر ایک پوری کہانی بنالی یا کسی بہت طویل افسانے کو مختصر کر کے ایک نیا رنگ دے دیا، تو چوں کہ وہ میری ہی تخلیقات تھیں اس لیے میں نے ان سے اس طرح فائدہ اٹھایا۔

س:شہر کوفے کا ایک آدمی، آپ کے باقی افسانوں سے ایک الگ فضا میں موجود دکھائی دیتا ہے،اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ایک شاعر تھے جمال احسانی، خدا مغفرت کرے بہت اچھے غزل گو شاعر تھے، ان کا انتقال بارہ، تیرہ برس قبل ہوا تھا، جوان آدمی تھے، خیر، ان کی پہلی کتاب جب چھاپی جا رہی تھی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت آپ نے کرنی ہے۔ وہ سعودی عرب اور گلف وغیرہ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ انہی دنوں وہ دبئی کے ایک مشاعرے میں گئے تو واپسی میں ان سے کہا کہ دیکھیے آپ نے مجھے ٹکٹ وغیرہ تو دیا ہے میں آپ سے کوئی مزید مطالبہ نہیں کرتا، ہاں اگر ممکن ہو تو مجھے عمرہ کے لیے یہاں سے ہی بھیج دیجیے۔ عمرہ پر گئے، واپس آکر بتایا کہ میں نے آپ کے لیے اور فلاں صاحب کے لیے طواف کرتے ہوئے دعا مانگی ہے، میں وہاں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا تو وہیں کے ایک صاحب میرے ساتھ ہو لیے کہ کہیں میں بیہوش نہ ہو جاؤں، میں تو اپنی بے بسی پر رو رہا تھا کہ ہم دل سے یاسر عرفات کے ساتھ ہیں اس کا اور فلسطینیوں کا دکھ دل سے ذکر کرتے ہیں مگر ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں ان کے جذبات سے بہت متاثر ہوا۔ اگلے دن میں نے انھیں فون کیا کہ میں تقریب میں نہیں آؤں گا آپ واپسی پر میری طرف تشریف لائیے گا۔ تو وہ شام میں تشریف لائے اس وقت تک یہ افسانہ تیار تھا۔ میں نے انھیں دکھایا تو بہت جذباتی ہوئے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار 'ج.ا' یہ جمال احسانی ہیں۔ بعد میں یہ افسانہ میں نے قاسمی صاحب کو فنون کے لیے بھیجا تو ان کا مجھے فون آیا، پوچھنے لگے یہ 'ج.ا' کون ہیں جب میں نے بتایا تو مطمئن ہو گئے اور انھوں نے ہی اسے چھاپا۔

جس طرح میر انیس کے بعد مرثیے کی صنف میں بقول شخصے کچھ کہنے کو نہیں رہا اسی طرح اردو ادب میں جو مقام اسد محمد خاں کے افسانوں کا بن چکا ہے اس کو دیکھ کر یہ خیال

ایک ماہر داستان گو

آصف فرخی / حسنین جمال

"میں دوران سفر زیادہ سامان ساتھ رکھنے کا قائل نہیں ہوں"، یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ دوڑ گئی، 'ماسوائے ایک جوڑا کپڑے، راستے کے لیے کچھ بسکٹ، اور یہ چند کاغذ'، اس گفتگو کے دوران وہ اپنا مختصر سامان ایک طرف ہٹا کر اپنے ساتھ ہی میری جگہ بنا چکے تھے۔ ایئر پورٹ کے ایسے بھیڑ بھڑ کے میں ان کا مل جانا مسیحا و خضر سے ملاقات کے مترادف تھا۔ ان کے ساتھ کئے ہوئے اسلام آباد، لاہور اور دہلی کے سفر کی وجہ سے میں پہلے ہی جانتا تھا کہ شاعر، نثر نگار اسد محمد خان جیسے ہمسفر کے ساتھ جہاز کے علاوہ وقت بھی پر لگا کر اڑتا ہے۔ بقول شخصے، وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

اب جہاز اڑنے میں ہونے والی عموی تاخیر، ائیر پورٹ پر ہونے والے کریہہ الصوت اعلانات، لمبی قطاروں یا شناختی مراحل ان سب چیزوں سے میں بے غم تھا کیوں کہ ان کے ساتھ کیا گیا چھوٹا سا سفر بھی بجائے خود ایک مکمل افسانہ ہوتا ہے۔ اسد بھائی کے بیانیے کی یہ معمولی تفصیلات اتنی اہم ہیں کہ جن سے ہم Coleridge کی نظم Ancient Mariner میں موجود "wedding guest" کی طرح صرف نظر نہیں کر سکتے۔

پرواز کے دوران ان سے گفتگو میں میری بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے کمال شائستگی سے مجھے نشست تبدیل کرنے کی پیشکش کی، اسد صاحب اب حفاظتی پیٹی باندھ کر، جم کے بیٹھتے ہوئے مجھے کہانی کے امکانات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ایک کہانیوں کی کتاب جو انہوں نے اپنی پانچویں جماعت میں پڑھنے والی پوتی سے لے کر پڑھی تھی، اس

کے بارے میں بتاتے ہوئے کہنے لگے، 'وہ عموماً مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی ہے، لیکن اس کہانی کو پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی کوند گئی۔

"اس ۱۰۰ صفحوں کی کتاب میں ۳۲ سے زیادہ کردار ہیں اور وہ مجھے بڑے مزے سے فرداً فرداً ان کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دیتی ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ سب کردار ایک بچہ ایسے مزے سے کیونکر پہچان پاتا ہے، درختوں میں رہنے والی ننھی پریاں، قنطورس (آدھا گھوڑا آدھا انسان)، بونے، یونی کارن (ایک سینگ والا گھوڑا)، یہ تو بھئی تخیل کو مہمیز کرنے والے وہ کردار ہیں کہ جنہیں میں عمر عزیز کی تیسری دہائی میں، اور انگریزی ادب کا حافظ ہونے کے بعد جان پایا تھا"۔
اسی دوران گفتگو کا رخ دیو مالا، اساطیر، براق، ققنس، نظریہ اضافت، پرانے کراچی سے ہوتا ہوا بھوپال کے ان شاعر کی طرف مڑ گیا جن کا تخلص ققنس تھا اور انہیں گزر اوقات کے لیے نواب سے وظیفہ ملتا تھا۔ یہ بھی یقیناً ان کے بیان کردہ چیستانِ تاریخ کا ایک لاینحل معمہ تھا!

'میں ونڈھیا چل کی آتما'، موسیقیت سے لبریز یہ نظم کئی سال تک ہمارے اسد صاحب بھوپالی کی پہچان بنی رہی۔ انہوں نے بھوپال سے میٹرک کرنے کے بعد، بمبئی (حالیہ ممبئی) کے جے جے سکول آف آرٹس سے ڈپلومہ لیا۔ تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں وہ لاہور بلکہ درحقیقت کراچی آئے اور ایک لمبے اور کٹھن سفر کا آغاز کیا۔ پرانی یادوں کو دہراتے ہوئے بولے، " کراچی یونیورسٹی آج بھی میری یادوں میں اپنے بکھرے ہوئے تمام شعبوں کے ساتھ موجود ہے، جو فی الحقیقت پرانے کراچی میں تھے، اور وہ، پروفیسر مایا جمیل، کیسے اپنا لیکچر شروع کرنے سے پہلے کسی کو نیچے بھیجا کرتی تھیں کہ جاؤ اور ٹال والے سے کہو کہ آرا چلانا بند کرے! " خیر، اب تو یہ نیا اجاڑ، بیابان، شہر سے کوسوں دور موجود کیمپس اس کی جگہ لے چکا ہے۔

انہوں نے ایم۔اے میں داخلہ لیا مگر پہلا سال ہی تھا کہ ان کے بڑے بھائی جو فوج میں ہوتے تھے، ان کا اپنڈکس کی وجہ سے دوران جراحت انتقال ہوگیا۔ "وہ صحیح معنوں میں میرے لئے

بہت بڑا بحران تھا اور مجھے خود کو سنبھالنا تھا۔ میں نے کراچی پورٹ ٹرسٹ میں کام کرنا شروع کر دیا، اور کوشش کرتا تھا کہ پڑھائی اور نوکری میں توازن قائم رکھوں، میں نے ریڈیو کے لیے بھی لکھنا شروع کر دیا"۔ انہوں نے بڑے مزے سے یاد کرتے ہوئے بتایا کہ ایک اسکٹ لکھنے کے انہیں ۱۵ روپے ملتے تھے لیکن سلیم احمد اور عزیز حامد مدنی جیسے وہاں کام کرنے والے لکھاریوں کی مسلسل حوصلہ افزائی شامل حال رہی۔

وہ بطور گیت کار جانے جاتے تھے اور بعد میں ان کے کچھ گانے بہت زیادہ مشہور ہوئے جن میں انوکھا لاڈلا، دیا جلائے رکھنا، وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے بتایا، 'اطہر نفیس اور افتخار عارف نے مجھے قائل کیا کہ میں ٹی وی کے لیے کچھ لکھوں'۔ یہاں سے ان کی شہرت اور کامیابی کے دوسرے دور کا آغاز ہوا، ٹی وی سیریل اور ڈرامے۔ ان کے ڈرامے آج تک ان لوگوں کو بھی بڑے ذوق و شوق سے یاد ہیں جو ان کے ادبی کمالات سے کماحقہ واقف نہیں۔ اسی دور میں انہوں نے مشہور رسالوں کے لیے کہانیاں اور افسانے بھی لکھے۔ "میں نے ہمیشہ اپنے کمرشل اور ادبی کام کے درمیان ایک حد فاصل رکھی ہے اور اسے کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اب تو خیر یہ کام میں ویسے ہی چھوڑ چکا ہوں، میرے بچے اب ماشاللہ برسر روزگار ہیں"۔ وہ ایام رفتہ سے بہت مطمئن نظر آئے۔

شمس الرحمان فاروقی انہیں 'خان خاناں' جب کہ عمومی طور پر نئے نثر نگار انہیں احتراماً اسد بھائی کہتے ہیں۔ ہماری واپسی کی پرواز کے دوران گفتگو کا سلسلہ انہوں نے دوبارہ شروع کیا۔ "میں اپنی زندگی میں فکشن کی طرف بڑی دیر سے متوجہ ہوا، میری پہلی کہانی 'باسودے کی مریم' تھی، میں نے یہ کہانی اطہر نفیس کو سنائی تو وہ بہت اداس ہو گئے، رونے لگے، خود میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ انور مقصود نے اسے میری زبانی سنا اور کئی پیراگراف زبانی یاد کر لیے۔ اس کے بعد میں نے 'مائی دادا' لکھی، احمد ندیم قاسمی نے انہیں 'فنون' میں چھاپا اور یوں میں مستقل لکھنے لگا۔

پرشکوہ انداز بیان جسے ان کا وسیع تجربہ جلا بخشتا ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی کہانیوں

میں ان کے ذاتی احساسات کی جھلک اور ایک مسلسل شعبے کی بھرپور بنت نظر آتی ہے۔
"A Harvest of Anger" کے نام سے ان کی منتخب کہانیوں کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے، جسے ہم ان کے مزاج کا بہترین عکاس کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شیر شاہ سوری پر لکھی گئی ان کی ۱۲ کہانیاں شامل ہیں۔

"میں اس کی طلسماتی شخصیت کا بچپن سے ہی اسیر تھا، ہم لوگ قلعہ رانے سین جایا کرتے تھے، جہاں اس نے تاریخی محاصرہ کیا تھا۔ بعد میں جب ٹیلی ویژن کے ایک ڈرامے کے لیے میں اس کی زندگی پر تحقیق کر رہا تھا، مجھے پروفیسر حسین خان کی لکھی ہوئی ایک شاندار کتاب ملی، وہ پشاور یونیورسٹی میں شعبہء تاریخ کے صدر تھے۔ ان کی کتاب مندرجات کے لحاظ سے بہت زیادہ تحقیقی صحت کی حامل تھی۔ اسی میں کچھ تفصیلات مجھے ایسی ملیں جنہیں بعد میں خود میں نے تراشا خراشا اور کہانی کی شکل دی "۔

شیر شاہی دور سے دلچسپی کا سبب بتاتے ہوئے کہنے لگے،' اس نے تقریباً ساڑھے چار سال حکومت کی، لیکن آپ اس کے دور کی کامیابیاں ملاحظہ کیجیے۔ جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ)، کہ جس کے بغیر آپ آج، اس دور میں بھی کہیں جانے کا سوچ نہیں سکتے۔ اس نے نوکر شاہی میں اصطلاحات متعارف کرائیں اور اس دور کے سکے پر ایک طرف کلمہء طیبہ دوسری طرف دیوناگری رسم خط کی تحریر ہوتی تھی۔ میں نے یہ تفصیلات اپنی کہانی 'روپالی' میں استعمال کی ہیں'۔ پھر شرارتی انداز میں بولے، 'مت بھولیے صاحب کہ وہ اسی دھرتی کا ایک بیٹا تھا اور پھر میری طرح پٹھان بھی'۔
شیر شاہ سوری کے بعد باتوں کا رخ پھر ان کی طرف ہو گیا، وہ بتانے لگے کہ ایک وقت تھا وہ راتوں میں دو بجے تک کام کرتے تھے اور یہ کہ اب بہت جلد تھک جاتے ہیں لیکن اپنی یادداشت سے کہانیوں کی کھوج تب بھی جاری رہتی تھی اور اب بھی جاری ہے۔ اتنی دیر میں حفاظتی بند باندھنے کے اعلانات ہونے لگے اور ہم جہاز کے اترنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسد بھائی، خدا انہیں زندگی دے، ہمیشہ ایک نئی کہانی کے ساتھ ملتے ہیں!

(بشکریہ روزنامہ ڈان)